بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

اشارات

روزوں کا مہینہ —— ماہِ صیام —— جب آتا ہے تو جہاں کہیں وبا دبایا اسلام بھی موجود ہوتا ہے، اس کی خوشبو فضا میں پھیل جاتی ہے۔ مسلمانوں کے جس گھر یا جس بستی یا جس ملک پر اِس ماہِ مبارک کا پَرتو پڑتا ہے، اُس کا نقشہ عام حالات سے بدل جاتا ہے۔ تارکِ نماز لوگ کپڑے پاک کر کے صفِ نماز میں آکھڑے ہوتے ہیں، احکامِ دین کی پابندی سے آزاد رہنے والے مرد و زن روزہ دار ہو جاتے ہیں، گھروں اور مسجدوں میں قرآن پڑھا جانے لگتا ہے، کچھ لوگ اسی مہینے میں زکوٰۃ ادا کرتے ہیں، بصورتِ دیگر عام صدقات دینے کے لیے ہاتھ کشادہ ہو جاتے ہیں۔ سحری اور تراویح اور افطار کے سلسلے بالکل نئی کیفیت پیدا کر دیتے ہیں۔ کتنے ہی لوگ ایسے ہوتے ہیں کہ بعض غلط مشاغل یا آمدنیوں یا جرائم کے پروگراموں کو اس مہینے میں معطل کر دیتے ہیں۔

یہ وہ ظاہری علامات ہیں جو اس حدیثِ رسولؐ کی تصدیق کرتے ہیں کہ شیاطین ماہِ رمضان میں پابجولاں کر دیے جاتے ہیں۔

قرآن و سنّت کے سرمایۂ علم و حکمت سے یہ حقیقت اخذ ہوتی ہے کہ ہر انسان جب پیدا ہوتا ہے تو اُس کے ساتھ ہی ایک شیطان اُس پر مامور ہو جاتا ہے کہ بچپن ہی سے اس کی ملکوتی قوتوں کو بے اثر بنائے اور سفلی رجحانات کو اُبھار کر عصیان و طغیان کی راہ پر اُسے گامزن کر دے۔ اب اگر کوئی صاحبِ ایمان فرد ماہ صیام کا حق ادا کرتا ہے، روزے رکھتا ہے، اپنی جسمانی ضرورتوں اور خواہشات کو احکامِ الٰہی کے تابع کر دیتا ہے، قرآن پڑھتا ہے اور سنتا ہے، نماز باجماعت خصوصاً تراویح

کے مجمعے میں شریک ہوتا ہے، سحر و افطار کے وقت مسنون کلماتِ ذکر و دعا ادا کرتا ہے، کچھ خیرات کرتا ہے، بعض لوگوں کا روزہ افطار کراتا ہے تو ظاہر ہے کہ اس کا شیطان تو زنجیروں میں جکڑا گیا اور بالکل بے بس ہو کے رہ گیا۔ اس طرح گویا ہزارہا مسلمانوں کے ساتھ لگے ہوئے شیاطین کے لیے کام کے راستے بند ہو گئے اور وہ مقید ہو کے رہ گئے۔

یہ حدیث جب کبھی بیان ہوتی ہے تو کچھ حضرات یہ سوال اُٹھاتے ہیں کہ اگر شیاطین قید ہو جاتے ہیں تو پھر برائی دنیا میں کیوں باقی رہتی ہے۔ اس کے جواب میں چند نکات قابلِ غور ہیں۔

۱۔ اہلِ کفر و شرک اور ایسے جرائم کار جن کی فطرت سلیم تباہ ہو چکی ہو، ایسے ظالم اور مستبد اور متکبر لوگ جنہوں نے اپنے جوہرِ انسانیت کو غارت کر دیا ہو، کوئی وجہ نہیں کہ اسیرئ شیاطین والی حدیث کا اطلاق اُن پر، اُن کی بستیوں اور اُن کے ممالک پر کیا جائے۔ مثلاً پہلا ماہِ صیام جب روزے فرض کیے گئے تھے، عین اسی مہینے کے وسط میں میدانِ بدر میں وہ پہلا معرکہ حق و باطل گرم ہوا جس کا ایک فریق مسلمان تھے جو پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی کمان میں جانیں لڑا رہے تھے، اور دوسرا فریق قریشِ مکہ اور اُن کے حلیف تھے جو پیغمبرِ خدا اور مسلم جماعت کو مٹا دینے کے ارادے سے اُمڈے تھے۔ اب یہ بات ظاہر ہے کہ مدینے کے مسلمانوں پر کام کرنے والے شیاطین تو مقید تھے، لیکن اشرارِ مکہ کے شیاطین کو قید میں ڈالنے کی کوئی وجہ معلوم نہیں ہوتی ہے۔

۲۔ شیاطین کا کام ایسا ہے کہ جیسے چھوت لگا دینا۔ وہ جب ظلم و شر اور عصیان و طغیان کے جراثیم انسانی قلب میں اُتار دیتے ہیں تو اگر ایمان و ضمیر میں قوتِ مدافعت ہو تو وہ کچھ روک تھام کرتا ہے۔ مگر شیاطین بھی ملیریا کے مچھر کی طرح بار بار اور روز روز جراثیم کی نئی کھیپ اندر داخل کرتے رہتے ہیں۔ یہاں تک کہ انسانی قلب و ضمیر میں مرض جڑ پکڑ لے۔ اب اگر شیاطین قید میں بھی ہوں تو ان کا کام جاری رہتا ہے۔ اُن کے بوئے ہوئے بیج اگر کسی مٹی میں جگہ پا چکے ہوں تو روئیدگی کا سارا عمل خود بخود ہوتا رہے گا۔ اس دور میں "آٹو میٹک کنٹرول" کی اصطلاح عام ہے۔ شیاطین بھی اپنے زہریلے اثر انسانوں میں عادت کے قانون کے ذریعے ایک طرح کا آٹو میٹک کنٹرول پیدا کر دیتے ہیں۔

شیاطین اپنے معمول انسانوں کے قلب و ضمیر میں شیطنت کا ایک اڈا یا عصیان و طغیان کا ایک دفتر قائم کر لیتے ہیں۔

۳۔ قرآن میں شیاطینِ جن کے ساتھ ساتھ شیاطینِ انس کا حوالہ ملتا ہے۔ یہ بڑی اہم بات ہے۔ دراصل انسانوں میں شیطنت کے کام کو پھیلانے کے لیے شیاطینِ انس ہی کی ضرورت ہوتی ہے — شیاطینِ جن تو ایک یا چند افراد پر خفیہ طریقوں سے کام کرتے ہیں۔ شیاطینِ انس رو در رو آ کر، اسٹیجوں پر تقاریر کرتے ہیں، اخبارات میں اداریے اور نوٹ شائع کرتے ہیں اور ادب میں شعر و افسانہ کو فنی جمال کے ساتھ سامنے لاتے ہیں۔ وہ استدلال کرتے ہیں، بڑے لوگوں کے حوالے دیتے ہیں، سلوگن ایجاد کرتے ہیں، اصطلاحیں وضع کرتے ہیں، جذباتی اُتار چڑھاؤ کا مظاہرہ کرتے ہیں — ہوٹلوں میں آپ کو چائے پلاتے ہیں۔ سینماؤں اور نائٹ کلبوں یا کبھی کبھار مسجدوں، اسکولوں اور لائبریریوں میں آپ کے پہلو بہ پہلو موجود رہتے ہیں۔ ان شیاطین انس کا کوئی توڑ نہیں۔ عالمی ادارات میں، سرمایے اور پروپیگنڈے کو کنٹرول کرنے والی تنظیموں میں، فوجوں اور عدالتوں اور پولیس میں، نہ جانے کتنی تعداد کہاں کہاں گھسی ہوئی ہے۔ پھر کوئی صدر ہوگا، کوئی سیکرٹری، کوئی وزیر، کوئی ڈائرکٹر کوئی محقق، کوئی کمانڈر، کوئی ناولسٹ، کوئی مصوّر، کوئی رقاص، کوئی فلم اسٹار — غرض ان کے ہزار روپ ہیں۔

شیاطینِ جن کا مقابلہ آسان اور شیاطین انس کا مقابلہ بے حد مشکل ہے۔ مثل ہے کہ آدمی کا شیطان آدمی۔ یعنی جس طرح آدمی کو سنوارنے کے لیے خود اسی کی جنس سے انبیاء اُٹھائے گئے، اسی طرح اُسے بگاڑنے کا بھی وسیع اور مؤثر کام آدمی ہی کر سکتا ہے۔

یہ بالکل ایسا ہی ہے جیسے کوئی بیرونی قوت کسی مُلک پر اپنا پنجہ گاڑنے کے لیے منصوبہ بنائے، اور پھر اس منصوبے کو جامۂ عمل پہنانے کے لیے ہدف بننے والے ملک کے اندر ہی سے وہ کچھ ایسے ایجنٹ فراہم کرے جو فلسفہ و فکر کے دائرے میں، ادب و شعر کے دائرے میں، صحافت اور پروپیگنڈے کے دائرے میں اور ٹریڈ یونینز اور لیبر کے دائرے میں، اساتذہ اور طلبہ کے دائرے میں، سیاسی پارٹیوں اور مذہبی گروہوں کے دائرے میں، بیرونی قوت کی دی ہوئی گائیڈ لائن کے مطابق کام کرتے رہیں۔ ابلیسی نظام بھی اسی نہج پر کام کرتا ہے، افراد کی انفرادی زندگیوں میں خلل اندازی کے علاوہ

شیاطین تاک کر ذہین لوگوں اور اہم شخصیتوں اور با اثر اکابر اور نوجوان ایجی ٹیٹرز پر اپنا جادو چلاتی ہیں یا شیطنت کے جراثیم ان کے اندر اُتارتی رہتی ہیں۔ یہاں تک کہ وہ خود شیاطین کے کان کترنے کے قابل ہو جاتے ہیں۔ اب شیاطینِ جن کا کام ختم ہو گیا۔ انہوں نے شیاطینِ انس تیار کر کے میدان میں اُتار دیے۔ اب خود انہیں تو صرف جائزہ لیتے رہنا ہے اور رپورٹیں اور اعداد و شمار مرتب کرنے کا اہتمام رکھنا ہے۔

اس بار ماہ صیام آیا تو معاشرے کا رنگ ذرا سا بدلا ہے۔ معلوم ایسا ہوتا ہے کہ پہلے کے مقابلے میں شیطانوں کو زیادہ بھاری زنجیریں پہنائی گئی ہیں۔

پاکستان بننے کے بعد یہ پہلا رمضان ہے جس میں کم سے کم لاہور کی حد تک (جہاں تک میرا مشاہدہ محدود رہے) بالعموم ایسا نہیں ہے کہ لوگ چلتے پھرتے سگریٹ پی رہے ہوں، یا پانی کی دکانوں پر کوکا کولا اور سیون اَپ سے شاد کام ہونے والوں کی قطاریں لگی ہوں یا چھوٹے بڑے ہوٹلوں، تنوری طعام خانوں اور اشیائے خوردنی و نوشیدنی بیچنے والے "فٹ پاتھیوں" نے چادریں تان رکھی ہوں اور ایسے مریضانِ عشق ہر جگہ ہجوم کیے ہوتے ہوں جو زبانِ حال سے ایک بہت پرانی مشہور گھٹیا سی غزل کا یہ مصرعہ الاپ رہے ہوں کہ "میں مریضِ عشق ہوں، میری دوا پردے میں ہے"۔ اب کے وہ پردے والے مریضانِ عشق بھی غائب ہیں، اور بنا بریں پردے بھی غائب! طعام اور شربت وغیرہ کی دکانیں کہیں تین چار بجے شام کو کھلتی ہیں۔ دوپہر یا قبل دوپہر کو یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ کسی نے پانی کی دکان سے فانٹا یا آر سی کی بوتل مانگی اور دکاندار نے انکار کر دیا۔

یہ تبدیلی اس حد تک صرف اس وجہ سے ہوئی ہے کہ مسجدوں میں خطبوں اور کتابی اور اخباری تحریروں کے ذریعے تو پہلے ہی احترام رمضان کی تلقین کی جاتی رہی ہے، اور بہت سے لوگ اسی تلقین کی وجہ سے رضا کارانہ طور پر احتیاط کرتے ہیں۔ مگر جب چیف مارشل لا ایڈمنسٹریٹر نے ابتدائے رمضان کے وقت احترام رمضان کی اپیل کی ہے اور اس کے لیے حکومت اور اس کے کارندے نیک نیتی اور مستعدی سے حرکت میں آگئے ہیں تو پھر کیسے رمضان کے ساتھ وہ مذاق روا رکھا جا سکتا ہے جو

ہمارے ہاں کے بڑے اور چھوٹے دُنیا پرستوں اور شکم پرستوں نے روا رکھا ہے۔

دوسرا اچھا شگون یہ ہے کہ متذکرہ صورتِ حالات گواہی دیتی ہے کہ پاکستانی قوم جیسے بھی بُرے احوال سے دوچار چلی آ رہی ہے، اگر اس کی اصلاح صحیح طریقے سے کرنے کی کوشش کی جائے تو اسے ہر قسم کی پستیوں سے نکالا جا سکتا ہے۔

ہم اسی تصوّر کے تحت کام کر رہے ہیں کہ ایک طرف دعوت و تلقین اور تربیت و تزکیہ کا کام ہونا چاہیے، دوسری طرف حکومت کو اجتماعی پہلو سے جو حصّہ کسی امر کے نفاذ یا انسداد کے لیے ادا کرنا لازم آتا ہے وہ اُسے کرنا چاہیے، اور پھر یہ یقین رکھنا چاہیے کہ یہ قوم خیر و فلاح کی طرف ہی لپکے گی۔

احترامِ رمضان کا یہ تصوّر بڑا کمتر درجے اور منفی نوعیت کا ہے جو ہمارے ہاں رائج ہے۔

اصل احترامِ رمضان یہ ہے کہ رمضان آئے تو آدمی عبادت و طاعت کے لیے کمر کس لے۔

احترامِ رمضان کا اوّلین تقاضا یہ ہے کہ روزے رکھے جائیں، تراویح ادا کی جائے، قرآن کو پڑھا، سُنا اور سمجھا جائے اور اس کو سرمایۂ عمل بنایا جائے۔

احترامِ رمضان یہ ہے کہ جھوٹ بولنے اور جھوٹے فلسفوں اور جھوٹے تصوّرات پر عمل کو ترک کیا جائے، غیبت، چغلی، بدزبانی اور بہتان بازی سے اجتناب کیا جائے۔

اور احترامِ رمضان ہی کا یہ تقاضا بھی ہے کہ اشیائے خورد و نوش اور دیگر ضروریات کا نہ تو ذخیرہ کیا جائے، نہ انہیں زائد منافع کے لیے فروخت سے روکا جائے، نہ ناپ تول میں فرق کیا جائے اور نہ گراں فروشی کی راہ اختیار کی جائے۔ اس ایک مہینے میں خدا اور رسولؐ کی محبت اتنی تو کارفرما ہونی چاہیے کہ بڑے بیوپاری اور چھوٹے کاروباری بہت ہی کم منافع پر اکتفا کریں، یا بعض صورتوں میں کوئی چیز بغیر منافع کے فروخت کریں، اور زیادہ بلند مقام یہ ہے کہ نقصان اُٹھا کر بھی خدا کے بندوں کو سہولت دی جائے۔ یقیناً اس ایثار کے بدلے میں اللہ تعالیٰ بقیہ گیارہ مہینوں میں ایثار کرنے والوں کو خاص برکات سے نواز سکتا ہے۔

ہمارے یہاں پہلے ایک روشن مثال ایسی قائم ہو چکی ہے کہ اُسے دیکھ کر کہا جا سکتا ہے کہ آج بھی ایسا ممکن ہے۔ جہاد ستمبر ۱۹۶۵ء کے دنوں میں اشیاء کی رسد میں مشکلات غیر معمولی تھیں، مگر لاہور کی حد تک تو میں گواہی دیتا ہوں کہ یہاں ضروریات کے نرخوں میں کوئی اضافہ نہیں ہوا۔ اگر ستمبر ۱۹۶۵ء میں ایسا ہو سکتا تھا تو اب اگست ۱۹۷۸ء میں وہی کچھ کیوں نہیں ہو سکتا۔

میں تو اس سے بھی آگے بڑھ کر یہ سوچتا ہوں کہ شہروں کے ہر محلے اور باہر کے ہر گاؤں میں ایسے لوگ ہونے چاہییں تھے جو افطار یا غذا کے مختلف سامان خرید کر باری باری روزہ داروں کو مختلف دنوں میں مفت فراہم کرتے۔ مثلاً کوئی صاحب اپنے گھر کے آس پاس کے دس، بیس یا سو پچاس گھروں میں کسی دن مفت گوشت تقسیم کرا دیتے، کسی دن کوئی صاحب پاؤ پاؤ بھر انگور یا کھجور کے دو چار درجن پیکٹ بانٹ دیتے۔ ایک ایک حلقے میں اگر ایسے دس دس اہلِ خیر آگے آ جاتے تو معاشرے کی فضا بے حد متاثر ہوتی۔ شاید دکانداروں کو بھی گراں فروشی پہ شرم آنے لگتی۔ مختلف فرموں کی طرف سے ایسا سلسلۂ خیر جاری ہو سکتا تھا۔

ان ساری چیزوں کے بعد احترامِ رمضان کی وہ شکل بھی سامنے آتی ہے کہ اگر کوئی شخص بیماری یا مسافرت یا کسی اور وجہ سے روزہ نہ رکھ سکا ہو تو کم سے کم اُس کی روزہ خوری کا حال دوسروں پر کھلنا نہیں چاہیے کہ یہ روزہ خوری کی تبلیغ کی ایک صورت ہے۔ ایک کو دیکھ کر دوسرا جرأت حاصل کرتا ہے۔

بہت اچھا ہوا کہ اس مرتبہ چیف مارشل لا ایڈمنسٹریٹر نے خود ہی افتتاحِ رمضان کی تقریب میں یہ ضرورت ظاہر کر دی کہ یوم پاکستان یا یوم استقلال ۲۷ رمضان المبارک کو منایا جانا چاہیے۔

فی الحقیقت دورِ نبوت کے ساتھ رمضان کے سلسلے میں پاکستان کو ایک مبارک نسبت حاصل ہے۔ دلی مدینہ کی اسلامی ریاست کا ظہورِ عام غزوۂ بدر سے ہوا۔ اور غزوۂ بدر اس پہلے ماہِ صیام کے وسط میں واقع ہوا جس میں روزے فرض کیے گئے تھے۔ پھر یہی رمضان نزولِ قرآن کا مہینہ بھی ہے۔ پاکستان کی تشکیل کا اسی مہینے میں واقع ہونا اپنے اندر ایک بشارت رکھتا ہے۔

یہ تو ہماری بدقسمتی تھی کہ انگریزی دور کے مسلط کردہ عیسوی کیلنڈر نے ہمارے ہجری کیلنڈر کو دبائے رکھا۔ اب اگر پاکستان میں ہجری کیلنڈر کو اہمیت دی جائے اور "ایام اللہ" پر ہماری نظریں مرتکز ہوں تو ہمارے بہترین جذبات کی آبیاری ہو سکتی ہے۔

کیا ہی اچھا ہوتا کہ اسی سال یوم استقلال ۲۷ رمضان المبارک کو منانے کا اعلان ہو جاتا اور اس کی تعمیل ہو جاتی۔

اب یہ سعادت آگے کے لیے ملتوی ہو گئی ہے۔

بائیس رمضان المبارک کی چھٹی گئیں، حالانکہ جب یہ اوراق قارئین تک پہنچیں گے تو یا تو وہ عید منا رہے ہوں گے، یا اس کے لیے تیاریاں کر رہے ہوں گے۔

ہماری عید کا مرکزی جوہر نماز عید اور صدقہ فطر اور تکبیرات ہیں۔ یہ ہماری مخصوص اسلامی تہذیب ہے کہ ہم یوم مسرت بھی مناتے ہیں تو خدا فراموشی کی کیفیت نہیں ہوتی۔ ہم ایک لمبے دورِ عبادت کی آزمائش و تربیت کے دور سے کامیابی کے ساتھ گذرنے پر خدا کے شکر کے طور پر عید الفطر مناتے ہیں۔ ہر چند کہ اچھے کپڑے پہننے اور اچھے کھانے کھانے اور عزیزوں دوستوں سے میل ملاقات اور بچوں کی تفریح اور جائز قسم کے کھیل تماشوں کی گنجائش دی گئی ہے۔ مگر عید الفطر کو کسی ایسے طریق سے نہیں منانا چاہیے کہ روزے رکھ کر اور تراویح پڑھ کر اور قرآن مجید کی تلاوت کر کے اور صدقہ خیرات کر کے جو کردار پیدا کیا گیا ہو، اُسے طوفانِ مسرت میں ڈبو دیا جائے، اور پھر سارا سال اس طرح گذرے کہ نہ خدا کا خوف، نہ رسولؐ کی محبت اور نہ آخرت کے حساب کتاب کا تصور۔ بس جہازِ عمر رواں پر سوار نجانے کدھر سے کدھر جا رہے ہیں۔

عید اس طرح منانی چاہیے کہ ماہِ صیام کی برکات ہمارے ساتھ رہیں اور سارا سال ہمارے لیے زادِ راہ بنی رہیں۔

(باقی اشارات بر صفحہ ۴۶)

(بقیہ اشارات) (۲)

اب ذرا ایک مختلف موضوع ـــــ مگر بہت ہی اجمال سے!

این۔ ڈی۔ پی قومی اتحاد سے الگ ہو گئی۔ اس پہ تبصرہ و گرفت کرنا قومی اتحاد کا کام ہے۔ میں صرف یہ کہنا چاہتا ہوں کہ یہ واقعہ حیرت ناک ضرور ہے۔ اس وجہ سے کہ این۔ ڈی۔ پی کی قیادت کے آخری بیانات سے یہ ظاہر ہوتا تھا کہ اگر اتحاد کی دوسری جماعتیں حکومت میں شامل ہو گئیں تو این۔ ڈی۔ پی شامل نہیں ہوگی، مگر وہ اتحاد کو چھوڑے گی نہیں۔ اس حیرت کے بعد دوسری حیرت اس بات پہ کہ علیحدگی کے اعلانِ اوّل میں یہ کہا گیا کہ ہم مخالفت اور ٹکراؤ کی پالیسی اختیار نہیں کریں گے۔ اور اس دعوے کی بھی خلاف ورزی پورے زور سے ہوئی، یعنی قومی اتحاد کی بقیہ جماعتوں کی نیتیں تک محفوظ نہ رہیں۔ مزید ستم یہ کہ جو پارٹی نکلتی ہے وہ بغلیں بجا کر کہتی ہے کہ بس اب اتحاد کو ختم سمجھیے۔ یعنی فخر ہے اس بات پہ کہ ہم نے یہ کارنامہ انجام دے دیا۔

یہ بھی خالص میری ذاتی رائے ہے کہ ہمارے ہاں سیاست میں نہ صداقت کا جوہر ہے، نہ اعتدال کا، (مستثنیات اپنی جگہ)۔ بلکہ مزید افسوس یہ کہ اس ملک میں قائدین کی اگر صفِ اوّل مرتب کی جائے تو ہمارا معاشرہ ہمیں پچیس افراد بھی ایسے نہیں دے سکتا جو علاقائی اور گروہی اور وقتی مفاد سے بالاتر ہو کر نازک لمحوں میں ملک و قوم کی بے لوث خدمت کر سکیں۔ شاید نازک تاریخی لمحوں کو پہچاننے والی بصیرت کا بھی قحط ہی پایا جائے گا۔

جمہوریت کی اہمیت اپنی جگہ مسلّم، مگر جمہوریت کا اس حد تک دین و ایمان بن جانا کہ اس کے بغیر اگر قوم کے گھر میں آگ بھی لگ جائے یا ڈاکو دروازے توڑ رہے ہوں تو بھی محافظین کے ساتھ تعاون نہیں کیا جائے گا۔ پہلے جمہوریت قائم ہو گی تو پھر آگ بجھانے کی سرگرمیوں میں حصّہ بھی لیا جا سکتا ہے۔ یہاں پچھلے مختلف ادوار میں عموماً، اور بھٹو صاحب کے دَور میں خصوصاً تشدد اور خیانت کا وہ درسِ عام ساری قوم کو دیا گیا ہے کہ اگر آپ بہترین جمہوری نظام بھی یہاں کھڑا کر دیں تو اس کے اندر سے بھی اور باہر سے بھی صدہا ماہرینِ نقبِ زنی اپنا کام شروع کر دیں گے۔ یہاں تک کہ جمہوریت کی چادرِ خاموس مچھلیاں پکڑنے کے جال میں بدل جائے گی۔

اگر قومی اتحاد کے زیرِ قیادت ہونے والے قومی الیکشن اور پھر اس کے نتیجہ اثر سامنے

آنے والے انکشافات سے صرف نظر کر لیا جائے تو ۱۹۷۰ء میں بھی تو آخر جمہوریت کا دور دورہ تھا اور فسطائی اقتدار نے جمہوری انتخابات کرائے تھے۔ اسی طرح ۱۹۷۰ء کے احوال اگرچہ بے نقاب نہیں ہو سکے بلکہ گردشِ ایام اور زلزلہ ہائے حوادث نے اُن پر مٹی ڈال دی، لیکن کون دعویٰ کر سکتا ہے کہ اس وقت جمہوریت کارفرما تھی۔ اوپر مارشل لا ہی کا تو تخت بچھا تھا اور اس تخت کے سائے میں وہی قوت چلت پھرت دکھا رہی تھی جس کے کمالات پوری طرح ۱۹۷۷ء میں نمایاں ہوئے۔ اس وقت آخر کیا جواز تھا انتخابات لڑنے اور حکومتیں قائم کرنے کا — اور بعد میں نتیجہ بھی کیا نکلا۔

میں سمجھتا ہوں کہ اس وقت پاکستان کو جو اندرونی فتنۂ عظیم اور دوسرے جھمیلے درپیش ہیں۔ اُن سے زیادہ خطرناک وہ بیرونی سازشیں ہیں جن کے کارندے ہمارے اندر موجود ہیں اور بعض بڑی نمایاں حیثیتوں کے ساتھ کام کر رہے ہیں۔ اقتصادی پیچیدگیاں سب کے سامنے ہیں۔

قوموں کی زندگی میں اس قسم کے مواقع جب کبھی آتے ہیں تو اُن کی سلامتی ترکِ اختلاف اور اتحاد میں ہوتی ہے۔ ایسے حالات میں حکومت اور اپوزیشن کا فرق مٹا دینا چاہیے، ایسے حالات میں صوبوں اور علاقوں اور طبقوں کے مفاد کی رسہ کشی باقی نہیں رہنی چاہیے — اور سازش کار قوتوں کو یہ محسوس ہونا چاہیے کہ پاکستان کے قلعے کی دیوار کی ہر اینٹ دوسری اینٹ سے اس طرح جڑی ہوئی ہے کہ کہیں کوئی رخنہ بن نہیں سکتا۔ بخلاف اس کے اگر نقشہ یہ ہو کہ ایک حکومت ہے اور ایک اپوزیشن، فلاں پارٹی کا رُخ مشرق کو ہے اور فلاں کا مغرب کو، کچھ لیڈر پاکستان بھر کے مفاد کو سوچتے ہیں اور کچھ مخصوص علاقوں یا طبقوں کے مسائل کو، ایک طرف کی قوت اسلام کو برسرِ عمل لانے کی آرزومند ہے اور دوسری جانب سیکولرازم کے علمبرداروں کا دھڑا ہے — تو ایسی صورت میں بیرونی قوتوں کے لیے کام کرنے کے ہزار راستے موجود ہیں۔

خدانہ کرے، کہیں ایسا نہ ہو کہ موجودہ مارشل لاء حکومت انتخابات کرا کے رخصت ہو تو پھر جمہوری قبا میں کوئی دیوِ استبداد رقص کرنے لگے۔ یا یہی مصیبت سامنے آجائے کہ چند ایسی بے اکثریت پارٹیاں کامیاب ہو جائیں جن کے اتحاد پر ہی ملک کی سلامتی اور قوم کی فلاح کا دارومدار ہو اور اتحاد کے ٹسٹ میں، بغیر حکومت ملے چند قوتیں جس طرح ناکام ہوئی ہیں، اُسے دیکھ کر اُن سے کیا اُمید کی جا سکتی ہے کہ وہ حکومت چلانے کے لیے بُنیانِ مرصوص بن سکیں گی اور اپنے خوبصورت

مواعید و اعلانات کو نبھا سکیں گی۔

ان دونوں صورتوں میں فدائیانِ جمہوریت کا رویہ کیا ہوگا؟

قومی اتحاد کے سامنے حکومت میں جانے کا سب سے بڑا اصولی مقصد یہ رہا ہے کہ انتخابات جلد کرانے اور جمہوریت کو بحال کرنے کی کوششیں تعاون کے راستے سے کی جائیں۔ یہ بڑی اچھی بات ہوگی کہ لیڈروں کی سواریوں کے گذرنے کے لیے جمہوریت کی "جرنیلی سڑک" بن جائے، مگر اس سڑک کے بنانے میں جو لوگ حصہ لینا چاہتے ہیں، ان کو اتنا بہ سر غلط بھی کیوں سمجھا جائے۔ کیا یہ ضروری ہے کہ وہ بھی بیٹھ کر جرنیلی سڑک بننے کا انتظار کریں۔ ایک غیر جمہوری حالت سے نکلنے کے لیے بھی تو کام کرنا ضروری ہے۔ کسی جمہوریت نواز کو اس سے گریز کیوں؟

یہ بات تو محض اصولاً کہی گئی ہے، ورنہ خاصے واضح امکانات کے باوجود اب بھی یہ نہیں کہا جاسکتا کہ قومی اتحاد سے متعلق جماعتوں کی عبوری حکومت قائم ہوسکے گی، کیونکہ انھوں نے بیوروکریسی کے زیر سایہ کام کرنے سے انکار کرکے ملک کی اس سب سے بڑی منظم جماعت کو اپنے خلاف کرلیا ہے (جمہوری نقطۂ نظر سے قومی اتحاد کا یہ بھی بہت بڑا کارنامہ ہے) اور ظاہر ہے کہ یہ قوت آخری لمحے تک روڑے اٹکانے کی کوشش کرے گی۔

کلمۂ آخر یہ کہ جمہوریت سے بھی کچھ چیزیں مقدم و برتر ہیں — مثلاً آزادی! اسی طرح بقا، آزادی اور سالمیت کی خاطر سنگین حالات سے جہاد کرنے والی قوم کے لیے اتحاد بہت ضروری ہے۔ اور معاملہ جب رسول اللہؐ کی اُمت کا پیش نظر تو اتحاد و اخوت لازمۂ ایمان ہیں اور حضورؐ کی ایک قیمتی میراث — اس کا تحفظ لازم ہے۔

(بقیہ رسائل و مسائل)

اسی طرح ایک بڑا زمیندار مشینی ذرائع اور کیمیاوی کھاد استعمال کرتا ہے تو اس سے پیداوار میں فرائش ہوتی ہے یا وقت اور محنت کی بچت ہوتی ہے۔ چھوٹا کاشت کار اپنے ہاتھ پاؤں اور جانور استعمال کرتا ہے۔ ان میں امتیاز برتنے کے لیے کوئی شرعی یا عقلی بنیاد نہیں ہے۔ البتہ حکومت کا مالیہ (آبیانہ نہیں) عشر سے پہلے ادا کرنے کی اجازت بعض قدیم فقہاء نے بھی دی ہے اور بعض جدید علماء کا فتویٰ بھی یہی ہے۔ اس کے حق میں دلیل یہ ہے کہ اس کا کوئی تعلق براہ راست اصلاح زمین، اضافہ پیداوار یا اخراجات کاشت سے نہیں ہے۔ اس لیے عشر محسوب کرنے سے پہلے اسے پیداوار میں سے وضع کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں۔